مقالات

تغیر کیا ہے؟

از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی۔ بی، اے

مغربی تعلیم اور اشتراکی پروپگنڈے کے اثر سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ خیال سرعت کے ساتھ پھیل گیا ہے کہ انسان کی خارجی زندگی اور تمدنی ماحول میں جو تبدیلیاں ہر زمانہ میں ہوتی رہتی ہیں ان کی وجہ سے اس کے اخلاقی اصول و نظریات میں بھی تغیر ہونا ضروری ہے چنانچہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے کہ جو مذاہب آج سی صدیوں پیشتر انسانی تمدن و اخلاق کی اصلاح کے لیے وجود میں آئے تھے وہ موجودہ ترقی یافتہ اور تبدیل پذیر حالات کا ساتھ نہیں دے سکتے، کیونکہ یہ مذاہب ایک خاص ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور اسی ماحول اور عہد کی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، موجودہ زمانہ میں جب کہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اور انسانی تمدن ایک نئے ارتقائی دور سے گذر رہا ہے، ان مذاہب کے اخلاقی اور قانونی احکام پر عمل کرنے کی کوشش بے سود اور لایعنی ہے۔ غرض کہ موجودہ زمانہ میں زندگی کے نئے حرکی (Dynamic) تصورنے ہر قدیم چیز کو ٹھکرا دیا ہے۔ آج کل کسی شے کی قدر و قیمت اس نقطۂ نظر سے متعین نہیں کی جاتی کہ اس میں صداقت کا جزو کتنا ہے، بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ وہ قدیم ہے یا جدید۔ حتیٰ کہ خیر و صداقت کے تصورات کو بھی اضافی قرار دیا جاتا ہے اور انھیں زمانہ کی تبدیلیوں کے تابع سمجھا جاتا ہے۔ اس نئے حرکی تصور کے پس پشت جو عقیدہ کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی مسلسل اور پیہم انقلاب و تغیر سے گذرتی رہتی ہے اور اس کی فطرت میں عدم تغیر یا ثبات و قرار کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ محض ایک مفروضہ ہے جو حجت و استدلال اور ثبوت کا اسی طرح محتاج ہے جس طرح کوئی دوسرا مفروضہ ہو سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ لے کر کھڑا ہو کہ "زندگی پیہم انقلاب اور جاوداں تغیر ہے" اسے خود تغیر کی ماہیت پر غور کر کے یہ تحقیق کر لینا چاہیے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات متحقق ہونی چاہیے کہ ہم کو تغیرات کا علم کن ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دیگر حقائق کی طرح تغیرات کا علم بھی ہمیں تجربہ سے حاصل ہوتا ہے؟ لیکن یہ تجربہ کیا شئے ہے جس پر ہماری تمام علمی موشگافیوں اور فلسفہ طرازیوں کا دارومدار ہے؟ کیا اس کا تعلق ماضی سے نہیں ہے؟ اگر ماضی کے حالات وواقعات اور اس کے افکار و تصورات حال اور مستقبل کے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتے تب تو یہ کہنا پڑے گا کہ ہمارے تجربات بالکل ہی بے معنی ہیں۔ کیونکہ تجربہ کا سارا مواد گذشتہ واقعات ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہمارے تعلیم یافتہ اصحاب کے کہنے کے مطابق یہ مان لیا جائے کہ زندگی ان معنوں میں ایک مسلسل تغیر ہے کہ ہر آنے والی حالت گذشتہ حالتوں سے مختلف ہوتی ہے تو یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ انسان آنے والے حالات وواقعات میں اپنے گذشتہ تجربات سے کیونکر فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ ان تجربات کی ترکیب وتشکیل ان احوال وواقعات نے کی ہے جنھیں آنے والی حالتوں سے کوئی ربط وتعلق ہی نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نئے حالات میں عقل ہماری مدد پر آجاتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود عقل تجربہ کا ایک وظیفہ (Function) ہے کیونکہ اس کو جو کچھ مواد ملتا ہے وہ تجربہ ہی سے ملتا ہے اور تجربہ سے الگ اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کا انفرادی یا معاشرتی تجربہ اسی صورت میں اس کے کام آسکتا ہے جب ہر نئی آنے والی حالت اور گذری ہوئی حالتوں کے درمیان کوئی مماثلت یا یکسانیت موجود ہو ورنہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہر نئے دور یا ہر نئی حالت اور گذشتہ ادوار واحوال میں ایک نوعی فرق واختلاف (Difference of Kind) ہوتا ہے تو پھر اجتماعی اور انفرادی تجربات کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی کیونکہ اس صورت میں تو تجربہ تمام اُن حالات وواقعات سے ماخوذ قرار پائے گا جو نئے حالات سے کوئی مناسبت رکھتے ہی نہیں۔ مثلاً قانون کو لیجیے کہ اس میں گذشتہ نظائر سے کام لے کر نئے پیش آنے والے واقعات پر حکم لگایا جاتا ہے۔ قانونی نظائر سے ہر زمانہ میں کام لیا گیا ہے اور آج بھی لیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر نئی حالت کے لیے فوری طور پر قانون وضع کرنا غیر ممکن ہے۔ گذشتہ حالات وواقعات کی بنیاد پر جو قوانین وضع کیے جا چکے ہیں انھیں نئے حالات پر منطبق کیا جاتا

ہے اور اس طرح قانون کی تجدید و توسیع ہوتی رہتی ہے۔ اب اگر نئے احوال و واقعات اور اُن گذشتہ حالات کے درمیان کوئی نوعی فرق ہوتا جن پر قانون مبنی ہوا کرتا ہے تو گذشتہ نظائر کا کیا فائدہ ہوتا۔ قانونی نظائر سے کام لینا ہی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ گذشتہ حالات و واقعات اور آئندہ پیش آنے والی حالتوں کے مابین کوئی جوہری اختلاف نہیں ہے۔ اسی مثال پر قیاس کرتے ہوئے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو چیز قانون کے دائرے میں ایک مختصر اور محدود مدت کے لیے صحیح ہے وہی معاشرت اور تمدن کی تاریخ میں طویل مدتوں اور زمانوں کے لیے بھی صحیح ہے یعنی یہ کہ گذرے ہوئے اور آنے والے ازمنہ کے درمیان کسی نوعی فرق کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر مختلف ادوار کے درمیان اس قسم کا فرق تسلیم کر لیا جائے تو تاریخ گذشتہ حالات و واقعات کا ایک بے معنی مجموعہ بن کر رہ جائے گی اور اس سے سبق حاصل کرنا یا اس میں اپنے لیے رہنمائی تلاش کرنا محض ایک عبث فعل ہو جائے گا۔ گذشتہ زمانہ کی تاریخ ہمارے لیے اسی صورت میں کارآمد ہو سکتی ہے جبکہ زمانہ گذشتہ اور زمانۂ حال میں کوئی بنیادی فرق یا تضاد نہ ہو۔ ورنہ اگر تغیر کوئی ایسا عمل ہے جس کی وجہ سے ہر زمانہ کا انسان دوسرے زمانہ کے انسان سے بالکلیہ مختلف ہو جاتا ہے تو پھر تاریخ کا مطالعہ کرنا فضول اور وقت کے سیاسی یا تمدنی مباحث میں اس کی عدالت سے فیصلہ طلب کرنا بیکار ہے۔

بلکہ ایسی حالت میں تو یہ بھی ناممکن ہے کہ تاریخی ارتقاء کی اس منزل پر ہم اُن انسانوں کے اجتماعی اعمال و محرکات اور طرزِ عمل کو سمجھ سکیں یا ان کی توجیہ کر سکیں جو ایک مختلف زمانہ میں پیدا ہوئے تھے اور جن کا ماحول ہمارے ماحول سے بنیادی طور پر مختلف تھا۔ کیونکہ جب تک ہم اپنے ذہن اور اپنی زندگی پر وہ تمام حالتیں نہ طاری کر لیں جن کے اندر سے زمانہ گذشتہ کا انسان گذرا تھا، ہمارے لیے غیر ممکن ہے کہ ہم اُس کے تمدن یا معاشرت سے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں یا اُن اعمال اور اُن کے محرکات کو سمجھ سکیں جو اُن سے سرزد ہوئے تھے۔ لیکن اگر ہمارے موجودہ ذہن اور ہمارے محرکات اور نفسی اعمال، اُن انسانوں کی ذہنی اور نفسی کیفیات کے ساتھ کوئی یگانگت یا مماثلت نہیں رکھتے تو اُن حالتوں کا ہم پر طاری ہونا جن کے درمیان سے وہ گذر رہے تھے ایک امر محال ہے۔ لہٰذا اس صورت میں ہمارے اور اُن انسانوں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ لیکن تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے

ہمیں کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ گذشتہ زمانہ کا انسان کسی معنی میں ہم سے بنیادی طور پر مختلف تھا، یا جو محرکات آج ہمیں جنگ و صلح، دوستی و دشمنی اور تعمیر و تخریب کی طرف لے جاتے ہیں وہ اُن محرکات سے مختلف ہیں جو ازمنۂ گذشتہ کے انسان کو مذکورۂ بالا اعمال پر مائل کرتے تھے۔ زمانہ اور حالات کی تبدیلیوں کی بنا پر انسان اور انسان کے درمیان کسی نوعی فرق کو تسلیم کرنا (جو اس دعوے کو متضمن ہے کہ انسانی زندگی مسلسل تغیر کی حالت میں ہے) گویا اس بات کو ماننا ہے کہ تاریخ کے محققین نے ازمنہ ماضی کے انسان پر جو کچھ لکھا ہے وہ محض وہم و خیال ہے اور ان محققین نے ایک ایسی نوع کی تاریخ مرتب کرنے میں بے کار اپنا وقت ضائع کیا ہے جو اپنی فطرت، اپنی نفسی کیفیات اور اپنے حیاتیاتی میلانات کے اعتبار سے موجودہ انسان کے مقابلہ میں ایک جداگانہ اور کم تر ہستی رکھتی تھی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ انسان کی بنیادی فطرت آج بھی وہی ہے جو سینکڑوں ہزاروں سال پیشتر تھی۔

اگر اشتراکیوں اور دیگر مغربی مفکرین کے اس دعوے کو تسلیم کر لیا جائے کہ زندگی محض تغیر اور انقلاب کی ایک داستانِ مسلسل ہے تو پھر انسان کی معاشرتی، سیاسی یا تمدنی زندگی کی بابت کوئی کلیہ یا قانون صحیح نہیں ہو سکتا حالانکہ مورخ کو قدم قدم پر ایسے کلیات ترتیب دینے ہوتے ہیں جن سے وہ مختلف زمانوں کے واقعات کی توجیہ کرتا ہے۔ اگر مورخ اس مفروضہ پر کام کرے کہ تاریخ کا ہر واقعہ بالکل یکتا اور منفرد ہوتا ہے تو وہ مختلف واقعات کی کڑیوں کو کیونکر ایک سلسلہ میں جوڑ سکتا ہے اور پھر تاریخ میں بے ربط واقعات کے سوا اور کیا چیز باقی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ جو شے مسلسل تغیر و انقلاب کی حالت میں ہو اس کے متعلق کوئی قانون یا کلیہ بنانا تو غیر ممکن ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خود اشتراکی لٹریچر ایسے کلیات سے بھرا پڑا ہے۔ مثلاً مارکس اور اینجلس کے اس دعوے کو لیجیے جس سے اشتمالی منشور کا آغاز ہوتا ہے:-

"انسان نے آج تک جتنے معاشرے قائم کیے ہیں اُن سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔ غلام اور آقا، امراء اور جمہور، سرمایہ دار اور مزدور، مختصر یہ کہ ظالم و مظلوم ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرِ پیکار رہے ہیں۔"

اب اگر اس کلیہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ زمانہ کے تغیرات سے انسان کے حالات میں خواہ کتنی ہی تبدیلیاں واقع ہوئی ہوں، بہر حال ایک حقیقت کبھی نہیں بدلی، اور وہ یہ کہ انسانوں کے درمیان طبقہ واری تفریق اور طبقہ واری جنگ برابر قائم رہی ہے۔ یہ محض ایک کلیہ ہے۔ انسانی زندگی کے متعلق ایسے صدہا کلیات اور بھی قائم کیے جا سکتے ہیں اور کیے جا رہے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض غلط ہوں جیسا کہ مارکس اور اینجلس کا مذکورۂ بالا کلیہ غلط ہے۔ لیکن بہت سے کلیات صحیح بھی ہوتے ہیں۔ ایسے جتنے کلیات صحیح ہوں گے اتنے ہی غیر تبدیل پذیر اور تبدیل اور دائمی حقائق کا ماننا لازم آئے گا۔

ظاہر ہے کہ ان حقائق کے غیر تبدیل پذیر اور دائمی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ......

انسانی فطرت کی جن خصوصیات پر یہ مبنی ہیں وہ مرورِ زمانہ اور تغیر احوال کے باوجود یکساں اور غیر متغیر رہتے ہیں۔ حرکت و تبدیلی کے اس تسلسل کے باوجود زندگی کے خارجی مظاہر میں جاری و ساری ہے، زندگی کی اصلی فطرت نہیں بدلتی۔ انسان کی فطری خصوصیات اور وہ غیر شعوری جذبات و ہیجانات (**Impulses**) جو اس کے تمام شعوری افعال کی قوتِ محرکہ ہیں، خارجی احوال کی تبدیلیوں سے غیر متاثر رہتے ہیں۔ پس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ماحول کی تبدیلی سے انسانی فطرت بدلی جا سکتی ہے۔ سطحی نظر سے دیکھنے والا اس غلط فہمی میں پڑ سکتا ہے کہ انسان میں اس تغیر سے کوئی جوہری تغیر واقع ہو جاتا ہے، کیونکہ سیاسی اور معاشی نظامات کے بدلنے سے انسانی اعمال میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ایسی تمام تبدیلیاں جو خارجی تغیرات سے پیدا ہوتی ہیں درحقیقت بنیادی تبدیلیاں نہیں بلکہ صوری تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ یعنی وہ صورتیں بدل جاتی ہیں جن میں انسانی فطرت اپنے خصوصیات کا اظہار کرتی ہے مگر خود یہ خصوصیات جوں کی توں برقرار رہتی ہیں۔

مثلاً انسان کی اس خصوصیت کو لیجیے کہ وہ جنگ و جدال کا عادی ہے۔ اب غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ جنگجوئی انسان کی ایک حیاتیاتی فعلیت (**Biological activity**) ہے جو ہزاروں سال سے بالکل ایک نہج پر قائم ہے اور اُن تمام تغیرات کے باوجود جو انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں واقع ہوتے رہے ہیں اس فعلیت

میں کوئی کمی بیشی یا تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ انسان اُس وقت بھی ایک دوسرے سے جنگ آزما رہتا تھا جب وہ فولاد کے بجائے نکیلے پتھروں کے اسلحہ استعمال کرتا تھا۔ اور آج بھی وہ باہم برسرِ پیکار ہے جب طبعی علوم سے واقفیت کے بغیر جنگ لڑنا بالکل غیر ممکن ہے۔ اس پوری مدت میں جو تبدیلیاں جنگ سے متعلق ہوئی ہیں وہ صوری تبدیلیاں تھیں۔ یعنی جنگ کے آلات واسلحہ بدل گئے، جنگی تدابیر اور طریقہ ہائے جنگ میں انقلاب برپا ہوگیا، فنونِ جنگ کی کایا پلٹ گئی۔ لیکن ان سب تبدیلیوں کے باوجود جنگ وجدال کے اسباب ومحرکات میں شمّہ برابر بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ آج بھی انسان اپنے معاشی تفوق اور قومی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے یا دوسروں پر اپنے عقائد ونظریات مسلط کرنے کی غرض سے قتل وخونریزی پر آمادہ ہوجاتا ہے اور پہلے بھی بالکل انہی اسباب کی بنا پر وہ باہم نزاع وفساد برپا کرتا تھا۔ وہ اخلاقی صفات جو صدیوں پیشتر فریقین کی فتح یا شکست پر موثر ہوتی تھیں، مشینوں اور آلات کی ترقی کے باوجود اب بھی اسی طرح فریقین کی فتح یا شکست کے لیے فیصلہ کن ہوتی ہیں۔ قومی یا جماعتی تخیل سے شدید محبت، اور اس محبت کے جنون میں زندگی کی راحتوں اور عیش وعشرت کی دلفریبیوں کو خاطر میں نہ لانا آج بھی فتح وکامرانی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور پہلے بھی تھا۔ اس لیے یہ دعویٰ کرنا بالکل جہل ہے کہ مرورِ زمانہ اور امتدادِ وقت سے اخلاقی نظریات اور اُن کے اثرات یا حیاتیاتی افعال اور ان کے اسباب ونتائج بدل سکتے ہیں۔ صوری تبدیلیوں سے اصلیت نہیں بدلتی۔ فطرت کتنے ہی نقاب ڈال کر سامنے آئے، دیدۂ بینا ہو تو اسے پہچانا جاسکتا ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

اسی طرح اس مشہور مقولہ کو لیجیے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے"۔ یہ مقولہ اپنے اندر ایک بڑی صداقت رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر تاریخی واقعہ پچھلے واقعات کی ہو بہو نقل نہیں ہوا کرتا اور تاریخ ان معنوں میں اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی کہ ہر نیا واقعہ گذشتہ واقعات کی محض تکرار ہو۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تاریخ کے مختلف ادوار اور ان کے حالات وواقعات کے درمیان ایک گہری مشابہت پائی جاتی ہے جس کی توجیہ کا اور کوئی طریقہ ممکن نہیں ہے بجز اس کے کہ تاریخی حالات وواقعات کی تشکیل میں انسان کی ان فطری اور غیر تبدیل پذیر

خصوصیات کا بڑا دخل ہے جو ہر زمانہ اور ہر عہد کے انسانوں میں یکساں طور پر مشترک ہوتی ہیں۔ خارجی مظاہر کی تمام تبدیلیوں اور تمدنی ارتقاء کی ساری منزلوں میں وہی ازلی حقائق اور بنیادی صداقتیں بار بار رنگ بدل بدل کر جلوہ نما ہوتی ہیں۔ تبدیلی صرف اُن اشکال اور مظاہر میں ہوتی ہے جن میں یہ صداقتیں ظہور کرتی ہیں۔ لیکن صورتوں کے بدلنے سے حقائق نہیں بدل سکتے۔ اس کی مثالیں ایک دو نہیں بے شمار دی جاسکتی ہیں کہ ایک ہی قسم کے حالات و موثرات کا ردِّ عمل انسان پر یکساں ہوتا ہے خواہ وہ کسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہو۔ یکساں اسباب و علل یکساں نتائج پیدا کرتے ہیں۔ جنگ عظیم کے بعد یورپ میں آمری حکومتوں کا عوام کے ساتھ جو طرزِ عمل رہا ہے وہ کلیسا کے اس طرزِ عمل سے کیونکر مختلف ہے جو اس نے عوام کے مقابلہ میں قرونِ وسطیٰ میں اختیار کیا تھا؟ کیا ہٹلر مسولینی اور اسٹالن کی زندگی میں پاپاؤں کی روح نے دوبارہ زندگی نہیں حاصل کی ہے؟ پاپائے روم کی معصومیت اور اس کے بری عن الخطاء (Doctrine of Papal infallibility) ہونے کا عقیدہ جو رومن کیتھولک عیسائیوں میں آج تک کسی نہ کسی درجہ میں باقی ہے، جرمنی اور اٹلی اور روس کے عوام اور نازی اور فاسسٹی اور اشتراکی جماعتوں کے اندر ایک نئے روپ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اس عقیدہ نے ایک مذہبی رنگ اختیار کیا تھا۔ جرمنی، اٹلی اور روس میں اس کا رنگ سیاسی ہے۔ لیکن بنیادی تخیل اور روح کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر کیا ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن کے پیروؤں پر نظر کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا سے آج وہ ذہنیت ناپید ہو گئی ہے جس کی اصلاح کرنے کے لیے قرآنِ حکیم نے اہلِ کتاب سے کہا تھا:

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔	اے اہلِ کتاب آؤ ہم تم دونوں ایک ایسے کلمہ پر جمع ہو جائیں جو ہم میں اور تم میں برابر ہو اور وہ یہ کہ نہ تو ہم خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کریں، نہ اس کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھیرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب قرار دے (رب تو بس اللہ ہی ہے)

اگر اس آیت میں اہل کتاب کی جگہ اسٹالن، ہٹلر اور مسولینی کے پیرووں کا نام لے لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس صداقت کی طرف قرآن کریم اہل کتاب کو تیرہ سو برس پیشتر دعوت دے رہا تھا، دنیا آج بھی اسی صداقت کے لیے تشنگی محسوس کر رہی ہے کیونکہ قومی لیڈروں اور ڈکٹیٹروں اور کارل مارکس جیسے یک رُخے انسانوں کو ارباب من دون اللہ آج بھی قرار دیا جا رہا ہے۔ یا پھر مشرکین عرب کے اس طرزِ عمل کو لیجیے جو انھوں نے آخرت کے وجود سے انکار کرتے ہوئے اختیار کیا تھا۔ کیا آج اشتراکی جماعت کے ارکان وہی طرزِ عمل نہیں برت رہے ہیں؟ مشرکین عرب بھی تو کہتے تھے کہ اس زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی کا ثبوت ہمارے تجربات و مشاہدات اور معلومہ ذخیرۂ علم سے نہیں ملتا۔ کیا آج روسی اشتمالیوں کا استدلال اس سے مختلف ہے؟ روسی اشتمالیوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ طبعی علوم کے نتائج تحقیق سے ماورائے مادہ کسی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔ نقطۂ نظر کے اعتبار سے عرب کے مشرکین اور بیسویں صدی کے اشتراکیوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ جو کچھ فرق ہے وہ مبلغ علم کا ہے، طرزِ ادا کا ہے اور زبان و بیان کا ہے۔ باقی رہی شرک و الحاد کی حقیقت تو وہ آج بھی اسی طرح موجود ہے جیسے تیرہ سو برس پہلے تھی

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ زندگی محض تغیر نہیں ہے بلکہ اس میں عدمِ تغیر کا عنصر بھی شامل ہے۔ انسان کے تمدنی اور معاشرتی ارتقاء سے وہ مظاہر و اشکال بدل جاتے ہیں جن میں حقائق نمود کرتے ہیں۔ لیکن زندگی اور فطرت کی بنیادی حقیقتیں اٹل ہیں۔ حرکت اور تغیر کے فلسفہ کو سمجھنے کے لیے زمین کی گردش کو بطور مثال سامنے رکھیے۔ ایک لحاظ سے دیکھیے تو زمین مسلسل گردش میں ہے۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے تو زمین اپنے محور پر قائم ہے اور اس کی ساری گردش و حرکت اسے اپنے محور سے نہیں ہٹا سکتی۔ ایک اعتبار سے زمین سورج کے گرد ایک بیضاوی دائرے میں حرکت کرتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس حرکت کے خطوط مقرر ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ زمین اپنے مقررہ راستہ سے ہٹ جائے یا کسی دوسرے دائرے میں حرکت کرنے لگے۔ ہر مرتبہ گردش کرتے ہوئے وہ بالآخر پھر انھیں نقاط سے گزرتی

ہے جن سے پہلے گذر چکی ہے۔ یہی حالت زندگی کی ہے کہ اس میں تغیر و حرکت بھی ہے اور عدم تغیر بھی۔ مذہب میں جمود اور ٹھیراؤ اس لیے پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے نمائندے حرکت و تغیر اور اشکال و مظاہر کی تبدیلیوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ لیکن اس جمود اور ٹھیراؤ سے زیادہ خطرناک حرکت و تغیر کا نیا فلسفہ ہے جو حقائق کے دوام و استمرار اور فطرت میں عدم تغیر کے عنصر کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اسی فلسفہ کے باعث آج انسان اپنے وجدان اور اپنی فطرت کے خلاف برسرپیکار ہے اور اس تمنائے خام میں مبتلا ہے کہ محض خارجی نظامات کے ردّ و بدل سے وہ دنیا میں فلاح و صلاح کا راستہ تلاش کر سکتا ہے۔

تاریخ افکار و سیاسیاتِ اسلامی

اسلام میں عجمی اثرات کے نفوذ اور انحطاط ملت اسلامیہ کے اسباب پر تنقید

اسلام کے نصب العین (حکومت الٰہیہ) کی تشریح۔ اسلام میں ملوکیت و قیصریت۔ پاپائیت و مشیخت کا نفوذ، ان کے آغاز، ارتقاء و انحطاط کی مفصل تاریخ۔ اسلام میں بیرونی علوم و افکار کا شیوع اور قرآن و حدیث و فقہ و فلسفہ و کلام اور تصوف پر ان کے اثرات و نتائج پر بحث و تنقید۔ باہمی نزاعات بربنائے سیاسیات و عقائد و فقہ و فلسفہ کے اسباب و نتائج۔ تجدید و احیائے دین کی مساعی اور زوال ملت اسلامیہ کی مکمل تاریخ۔ عصر حاضر سے اسلام کا تصادم اور مستقبل کی تعمیر۔

اسلام کی سیاسی و ذہنی تاریخ کو مرتب کرنے کی یہ سب سے پہلی کوشش ہے۔ تقریظ از مولینا عبید اللہ سندھی صاحب، تقریب از چودھری غلام احمد صاحب پرویز، مولف "معارف القرآن"۔ دیباچہ از مولانا اسلم جیراجپوری صاحب اور مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔

حجم تقریباً ۴۰۰ صفحات مع دیباچہ وغیرہ، سائز ۲۰ × ۲۶، قیمت مجلد پانچ روپیہ۔

عبد الوحید خاں۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ۹۔ لاٹوش روڈ لکھنو